اُردو ادب اور شاعری

از۔ آفتاب احمد خاں، ایم۔ اے (انگلش و اُردو)
معرفت: حمیدیہ کلینک، نواب کا چوراہہ۔ بے پور ۳۰۲۰۰۳۔

مغل عہدِ حکومت میں جب ہمارے ملک نے سیاسی حیثیت سے
ح معنی میں ایک اکائی اور وحدت کی شکل اختیار کی تو ایک ملک کے لیے
یک واحد زبان کی ضرورت بھی محسوس ہوئی، چنانچہ ابتدأ ہر صوبہ کی
یسی زبان میں مسلمانوں نے اپنے عربی و فارسی الفاظ ملا کر ہر صوبہ کی
بان کو ہندوی کا لقب دیا۔ آخر شاہ جہاں صاحبقراں کے عہد میں
اص پایۂ تخت دہلی (۱۶۴۷ء) کی ہندوی زبان نے سارے
ں ٹکسالی زبان کی حیثیت سے رواج پایا جو شروع میں زبان اردوئے
لی یعنی دارالسلطنت یا شاہی قلعہ کی زبان کہلائی لیکن بقولِ محقق
ہیر پروفیسر حامد حسن قادری مرحوم یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اس زبان
لیے اُردو کا لفظ کب سے اختیار کیا گیا۔ ۲؎ البتہ یہ قیاس درست
ظر آتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ سے ہندوستان میں اُردو کا لفظ لشکر اور
شکرگاہ کے معنوں میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ اسی لیے اس دور

© rasailojaraid.com

میں بازار لشکر کو اُردو بازار کہا جاتا تھا' بہ ایں سبب "برعظیم" ہندو پاک کے کئی شہروں میں اس نام کے بازار تاحال موجود ہیں' اجمالی طور پر یہی اس زبان کی تاریخ ہے۔

کسی زبان کے ساتھ بطور لاحقہ لفظ "ادب" بھی اس کا جزو لاینفک ہوتا ہے۔ لہذا یہاں اختصاراً لفظ ادب کی وضاحت کرنا بھی ضروری ولابدی معلوم ہوتا ہے۔ لفظ ادب کی تاریخ مختلف ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ہم تک پہونچی ہے۔ لفظ ادب کے قدیم ترین معنی عادات' طرز عمل یا اُس طریقہ کے ہیں جسے آدمی وراثت میں پائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لفظ "ادب" کا صیغۂ جمع ہے جس کے لغوی معنی خو' ڈھنگ' عادت' طریقہ یا طرز عمل ہیں نیز یہ کہ "ادب" 'داب' کی ترقی پذیر شکل ہے۔ بعد ازاں اس لفظ کے معنوی ارتقاء کی وجہ سے عملی اور اخلاقی پہلوؤں میں اس کے معنی آسان اور نمایاں تر ہوتے گئے اور اس کا معنوی دائرہ عمدہ صوفیانہ عادات بہتر تربیت اور اچھے اخلاق وغیرہ پر محیط و محتوی ہو گئے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ نظر رہے کہ پہلی صدی ہجری کے زمانے سے ہی متذکرہ مفاہیم کے دوش بدوش یہ لفظ معلمانہ اور متعلمانہ معنی پر بھی دلالت کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس معنی پر اس کی گرفت کمزور پڑتی گئی اور جہاں تک اس کے معنوی ارتقاء کا تعلق ہے تو اس نے فرانسیسی لفظ "لٹریچر"' جس کا اطلاق ہر اُس لفظ پر ہوتا ہے جو زبان کے حدود کے اندر فکر عمیق اور نگاہِ حساس کے نتیجہ میں تحریر کی جائے' کا معنی پا لئے۔ بہر سو اس کے مجموعی معنی ہوئے عمدہ عادات و اطوار' فصاحت و بلاغت' تنقید و تبصرہ اور اشعار و انساب وغیرہ۔ باعتبارِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذکورہ معنی ادیب کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ وہ شخص جس میں نیک خصلتیں جمع ہوں وہی ادیب یعنی ادب جاننے والا ہے۔"

ادب ان کتابوں اور صرف اُن کتابوں پر مشتمل ہے جو اول تو اپنے موضوع اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے عام انسانی مذاق کے موافق ہوں اور دوسرے یہ کہ اُن میں زبان و بیان کی لطافتوں کو اصل الاصول قرار دیا گیا ہو۔ ایک ادبی شہ پارہ علم ہیئت، معاشیات، فلسفہ یا تاریخ کے مضامین سے اس وجہ سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ کرنے والوں کے صرف ایک گروہ کو محظوظ نہیں کرتا بلکہ عام انسانوں کو سرور و نشاط بخشتا ہے دوسرے اس سبب سے بھی کہ علم ہیئت یا تاریخ وغیرہ کا کام علمیت میں اضافہ کرنا ہے اور ادب کا کام یہ ہے کہ خواہ معلومات میں ترقی ہو یا نہ ہو لیکن وہ جس پیرایۂ بیان میں موضوع پیش کرتا ہے وہ اس قدر دلچسپ ہو کہ انسان کی جمالیاتی (Aesthetic) تشنگی دور ہو جائے اور سامع یا قاری یہ سُن کر اور پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بالفاظ دیگر ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے اور قدرت نے انسان میں جن سرمدی اشیاء کو ودیعت کیا ہے ان ہی کے اظہار کو ادبِ لطیف کہا جاتا ہے۔

کسی بھی زبان کی ترویج و ترقی کا انحصار اس قاعدۂ کلیہ پر ہے کہ وہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام پسند بھی ہو، اپنے، بیگانے، جانے انجانے سب ہی اُس کے دلدادہ ہوں، دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں اگرچہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگرچہ زبان کی عمر جیسا کہ گذشتہ سطور میں گذرا کچھ زیادہ طویل نہیں، پھر بھی یہ زبان اپنی لچک، شیرینی، لطافت و نزاکت اور ربط باہم کے سبب انگریزی کے بعد دنیا کی تمام زبانوں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ علاوہ بریں کسی بھی زبان کے ادبی شہ پاروں سے اس کا تصنیفی سرمایہ بھی کچھ کم نہیں چونکہ یہ زبان ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی لہذا یہاں کے ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے اس کے نقش و نگار سنوارنے، بنانے میں اپنا اپنا خونِ جگر اور سوزِ دماغ یکساں طور پر صرف کیا ہے اس لیے اس زبان کو ہندوستانی کہنے پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ اس نے ہندوستانی ماحول میں ترقی کی اور اس کی ترقی میں دونوں مذاہب کے لوگوں کا برابر تعاون رہا۔ اُردو زبان و شاعری نے ہندوستانی ماحول، دیو مالاؤں اور موضوع کے اعتبار سے ہندوستان کی ہر چیز کو اپنایا، اس وجہ سے اس زبان میں وسعت پیدا ہوئی اور یہ ایک مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن گئی۔

اُردو شاعری کے اصناف سخن میں غزل سب سے مقبول ترین صنف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی پشت پر زندگی کے ارتقاء کی طویل کہانی ہے، اس میں تمدنی وراثت اور تہذیبی اثرات کے اجزاء خصوصی کی جلوہ گری دکار فرمائی بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ اردو غزل کا پنچھی گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے الگ تھلگ نہیں رہی بلکہ اس میں ایک سماجی احساس اور حیاتِ انسانی کے تقاضوں کا بھرپور سامان موجود ہے۔ صوفی فلسفہ اور درشن کے امتزاج و آمیزش کے سبب اس میں نہایت اعلیٰ موضوعات کا اظہار اور بیان ہوا ہے۔ مثلاً ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمہیں سوچ کر بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مشت خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

خواجہ میر دردؔ اور حضرت مرزا مظہر جان جاں علیہ الرحمہ جیسے عظیم صوفی شعراء نے اس میں سارے زمانے کے درد و احساسات کی ایک وسیع و عریض اور عریض اور نئی دنیا سمو دی ہے۔ چنانچہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے امیرؔ مینائی نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دوسری طرف غالب و مومن نے اسے کائنات کی وسیع و عریض فضاؤں اور بسیط خلاؤں سے پرے پہونچا دیا ہے۔ ؎

منزل اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا　　(غالب)

یا ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا　　(غالب)

غزل ہمارے یہاں سب سے زیادہ مقبول صنف شاعری اس لئے ہے کہ وہ ہمارے دل اور سماج کی جو روداد ہے اسے پوری دفاداری اور شدت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ غزل اردو شاعری کی صنوف میں مستحکم ترین صنف ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی پشت پر صدہا فنکاروں کی صناعانہ فتوحات اور گرانقدر تخلیقات کے طویل اور زریں سلسلے ہیں جو ماضی میں دور تک چلے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ غزل اپنے بنیادی رمزیاتی اسلوب کی مدادت کے باوجود ہر دور میں بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر بڑے شاعر کے کلام میں اک نئی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔ بیان اور ابلاغ و ترسیل کی لاکھوں نزاکتوں اور بے شمار لطافتوں سے اس کا دامن لبریز ہے۔ افکار و تأملات، احساسات و انفعالات، حقائق و بصائر اور اسالیب و صور کے اس حیرت انگیز طلسم خانے کا جواب فارسی کے علاوہ دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری زبان اور شاید ہی کوئی دوسرا ادب ہو جو پیش کرنے کی جرأت کر سکے۔ اردو شاعری علی الخصوص غزل میں زبان و بیان کی فصاحت اور سادگی، سوز و گداز نیز مضامین کی تاثیر و جدت اور تخیل کی ندرت، ایسی خوبیاں ہیں جو کسی زبان کو شاذ و باید ہی نصیب ہوں۔ اردو شاعری کا ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم کہا جا سکتا ہے۔ بقول غالب: ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

یہ قول نہ صرف غالب بلکہ پوری اردو شاعری پر صادق آتا ہے۔ حسن تغزل کی شاعری گنجینۂ معنی کا بہترین نمونہ ہے، جس ایجاز و اختصار کے ساتھ غزل کے کسی ایک شعر میں بڑے سے بڑے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ فارسی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ نہ صرف ادبی مجالس بلکہ سیاسی و سماجی اجتماعات حتیٰ کہ پارلیمنٹ کے خشک مباحث تک میں تاثیر اور دلنشینی پیدا کرنے کے لیے اردو شاعری کے غزل کے اشعار سے کام لیا جاتا ہے، سینما، تھیٹر نیز دیگر تفریحی اور کلچرل پروگراموں کی تو اردو شاعری گویا جان اور جزءِ لاینفک ہے۔ جنگِ آزادی میں اس کے نمایاں کردار اور اہم رول ادا کرنے کے سلسلے میں یہاں کچھ عرض کرنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تطویل کا سبب ہو گا کہ یہ موضوع ایک علیحدہ مقالہ کا متقضی ہے۔ البتہ اتنا عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ :

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

جیسے سینکڑوں اشعار نے نحیف و ناتواں لوگوں میں قوت و توانائی اور مردہ دلوں میں یہ کہہ کر روح پھونک دی تھی :

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اور یہ کہ ؎

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

اُردو شاعری میں اضافت کی مدد سے تشبیہوں، استعاروں اور لفظی تصویروں کا جو آئینہ خانہ بنایا گیا ہے، اس کی مثال دوسری زبانوں کی شاعری میں ذرا مشکل سے ملے گی۔ اس سلسلہ میں اُردو، فارسی کے دوش بدوش ہے اور کبھی آگے بھی بڑھ جاتی ہے۔

روایت پسندی اور بعض زوال پذیر رسوم و عادات کے باوجود، جو اُردو شاعری میں دبستان لکھنؤ کے اثرات سے مروج ہوئیں، محض رخ و رخسار اور زلفِ محبوب کی کہانی نہیں بلکہ اس کے برعکس اُردو زبان و ادب کے بڑے غزل گو شعراء نے زندگی کا ساتھ دیا ہے اور ہر ایک نے اپنے لافانی اشعار میں سیاسی و معاشرتی، تہذیبی و تمدنی اور خارجی و اندرونی صداقتوں کو جذب کیا ہے۔ اگر ہم اردو شاعری کے ارتقائی مراحل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا تقابلی مطالعہ کریں معلوم ہوگا نسبتاً آج وہ ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکی ہے اور گل و بلبل، لب و رخسار اور خالِ محبوب سے کتنی دور پہنچ گئی ہے۔ اس وضاحت کے بعد اس اعتراض کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اردو شاعری میں اخلاقی بلندی کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ یہ پستی سکھلاتی ہے، حالانکہ شاعری تہذیب اخلاق کا بڑا ذریعہ ہے لیکن اول تو ہر شاعر ریفارمر اور مصلح نہیں ہوتا اور نہ ایسا ہونا ضروری ہے، دوسرے ہمیں یہ تسلیم کہ ہر اردو شاعر نے اصلاحِ اخلاق کو مستقل موضوعِ سخن نہیں بنایا۔ لیکن اس کے علی الرغم اُن کے دواوین اخلاقی عناصر، گرمیٔ حیات، سوز و گداز، اخوت و مساوات اور انسانی ہمدردی وغیرہ امور سے خالی بھی نہیں اگر سطحی نظر سے بھی اُن کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اُن کے کلام میں اصلاحِ اخلاق کی بلندیاں نمایاں طور پر دکھائی دیں گی۔ مثلاً حفیظ جالندھری اپنے احباب کی دلی فطرت کی اصلاح کتنے پیرایہ میں کرنا چاہتے ہیں:۔

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یا پھر ؎

اُن کو دے آئے ہیں خود اپنی محبت کے خطوط
غمگساروں کی ذرا نامہ بری تو دیکھو

دراصل اردو شاعری نے حیاتِ انسانی کے ہر موڑ پر اس کی ترجمانی کی ہے اور اُس کا ساتھ دیا ہے۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ وقوع پذیر ہوا جس کے سبب بنگال کے نکل جانے سے ہماری معاشیات کی ریڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ی ہماری لٹ گئی اس وقت بنگال اور کرناٹک کے خزانے ڈھل ڈھل کر انگلینڈ پہونچ رہے تھے اور انہی خزانوں کی بدولت وہاں صنعتی انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ اور ہندوستان روز افزوں مفلس و قلاش ہوتا جاتا تھا۔ ہماری اس حالتِ زار کو شیخ غلام احمد ہمدانی مصحفی امروہوی متوفی ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء نے ایک شعر میں یوں واضح کیا ہے ۔ ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

اور subsidiary Alliance پر شیخ قلندر بخش جرأت متوفی ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء جیسے غزل گو شاعر نے کہا ۔ ؎

کہیے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر
انگریزوں کے ہاتھوں قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ نہ پڑھائیں سو یہ منہ سے بولیں
بنگال کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

اور آج، ارتقاء کی منزلیں بتدریج طے کرتی ہوئی اردو غزل اپنے لغوی معنی اور خالص رنگِ تغزل سے کتنی دور اور آگے پہونچ گئی ہے ۔ ؎

زندگی عارض و کاکل کی گزرگاہوں سے
بڑھتے بڑھتے رسن و دار تک آپہنچی ہے

دراصل شاعر کا فن اور اس کا ذہنی سفر ذات و کائنات کی کشمکش اور تخیلات کی وادیوں کا ایک ایسا رزمیہ (Epic) اور ایک ایسا دشتِ تمثیل ہے جس کی تفہیم کے لئے اس لمحۂ سکوت و تحیر کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضرورت ہے جس میں ہر صورت خود اپنا مفہوم بن جاتی ہے۔ چنانچہ شاعری کا بلاغ خونِ دل سے سیراب اور سوزِ جگر سے منور ہوتا ہے، شاعری صرف لطف اندوزی کا نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کی عقدہ کشائی کا ذریعہ ہے۔ اس کی آسانیاں مشکلیں اور اس کی مشکلیں آسانیاں پیدا کر دیتی ہیں۔ شاعری کیفیت کے ملکوں کی سیر ہے، صحرا نوردی اور کوہ کنی ہے۔ تمناؤں کی تربیت اور تہذیب ہے، شاعری جنون کا سبق دے کر ہوش کے آداب سکھاتی ہے، جذبات کو تہہ و بالا کر کے سکون کے نقشے بناتی ہے۔ اس کی مثبت پر خواہ اخلاقی اور روحانی مصالح ہوں یا نہ ہوں، کیونکہ یہ ایک آزاد انسان کی واردات قلبی کے سوا کچھ نہیں مگر شاعر کی ذہنیت اس کے ادراکِ حقیقت پر غالب نہیں آنی چاہیئے یہی شاعری کی آبرو اور جان ہے، اسی ادراکِ حقیقت کی ترجمانی کا واضح انکشاف غالب نے کیا ہے: ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی شاعر کے لیے انسان ہونا اور آگاہ ہونا اک دردِ بے درماں ہے:۔

شکوۂ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانہ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

آج غزل کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا ہے۔ جس میں زندگی کے ہر موضوع کو سمو لیا گیا ہے، زبان کے اعتبار سے بھی سادگی و صفائی کی طرف توجہ ہوئی اور پیچیدہ گنجلک اندازِ بیان متروک ہوا لہٰذا آج اس میں انسانی جذبات کی صاف ستھری تصویریں نظر آنے لگی ہیں عشق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محض بوالہواسی کے جذبات کا اظہار نہیں رہ گیا بلکہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی اور سیاسی نصب العین تک کے لیے عشق کا استعارہ استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر عشق کا غم انسانی دکھ درد کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہو گیا کہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ غزل کے شاعر نے بھی زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں ملائیں اور اُن کو اپنے ہاں جگہ دے کر غزل کی حقیقت سے قریب تر کر دیا۔

زبان زندگی کو متاثر کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اور زندگی کی ترجمانی کا وسیلہ بھی، مگر اس کے لیے تنگ نظری سے گریز اور فراخ دلی سے کام لینا لازم ہے۔ اس حیثیت سے اُردو کی وسیع المشربی اور کشادہ دامانی پر اگر ہم ایک نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی فرہنگ و مصطلحات میں عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، ہندی، انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی و لاطینی اور ہمارے ملک کی تمام مقامی و صوبائی زبانوں کے الفاظ ملیں گے۔ درحقیقت اُردو ادب اور شاعری کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ "خُذ ما صفا و دَع ما کَدَر" یعنی اچھے کو اختیار کرو اور بُرے سے گریز۔

(ختم شد)

© rasailojaraid.com